ڈاکٹر سید عبدالباری

مولانا فراہی اور شعریات مشرق

مولانا حمیدالدین فراہیؒ گذشتہ صدی ہجری کی نابغہ روزگار شخصیتوں میں سے تھے، جنھوں نے قرآن حکیم کی تفسیر و تفہیم میں جو مقام بلند حاصل کیا اور کلام اللہ کی دورِ حاضر کے ذہن اور عصر مسائل کے تناظر میں تشریح و توضیح کے سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے انھیں فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ مولانا فراہیؒ مختلف علوم و فنون میں جو نشاناتِ راہ چھوڑ گئے ہیں ان کی روشنی میں علم و تحقیق کے قافلے اپنی منزل کا سراغ پاتے رہیں گے۔ موصوف کو عربی زبان وادب نیز ادبیات پر جو غیر معمولی قدرت حاصل تھی اس کے حیرت انگیز کرشمے ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ علماء و صوفیہ، مبلغین و داعیانِ حق، مفسرین و فقہاء اور اہل درس و تدریس کو انھوں نے جن گراں قدر خزائن فکر و تحقیق سے نوازا ہے اس وقت مجھے اس پر کچھ اظہار خیال نہیں کرنا ہے بلکہ موصوف نے علم بلاغت و بیان کے ضمن میں ہماری پوری مشرقی شعریات پر جس کا مبداء یونان قدیم کی شعریات و انتقادیات ہے جو گراں قدر رائے ظاہر فرمائی ہے اور جو بصیرت افروز نکات غور و خوض کے لیے عطا کیے ہیں انھیں اس مقالہ میں موضوع گفتگو بنانا چاہتا ہوں۔ مولانا کی مشہور و معروف کتاب "جمهرة البلاغة" کا اس صدی عیسوی کے ابتدائی عشرہ میں تعارف کراتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے تحریر فرمایا تھا کہ" یہ تصنیف اس زمانہ میں اس قدر مفید اور ضروری ہے جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جاں کے لیے آب زلال "۔ اس مقالہ میں اس آب زلال کے چند جرعات کی قدر و قیمت بیان کی گئی ہے۔

مولانا فراہی قرآن کریم کے نظم اور اس کی بلاغت اور اعجاز کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات پر شکوہ سنج ہیں کہ فارسی اور عربی کے علمائے بیان و بلاغت نے فصاحت و بلاغت کا جو فن مرتب کیا وہ افسوس ہے کہ ناتمام و ناقص تھا اور تمام لوگوں نے اسی فن کے موافق قرآن مجید کی

فصاحت و بلاغت ثابت کی۔ مولانا فراہی نے فصاحت و بلاغت کے جدید اصول قائم کرتے ہوئے قدماء پر بلکہ قدماء جس چراغ کی روشنی میں سرگرم سفر رہے ہیں یعنی ارسطو پر زبردست تنقید کی۔ مولانا کو افسوس تھا کہ ماضی میں سخن شناسی کا کوئی معتبر معیار قائم نہ ہو سکا اور زیادہ تر لوگ حکمائے یونان کے خیالات سے گمراہ ہوتے رہے۔ مولانا کے دل میں یہ آرزو تھی کہ یونانی شعریات کے بجائے جسے مغرب و مشرق میں غیر معمولی قبول عام حاصل ہوا عرب شعریات کو مرتب کیا جائے اور شعر و سخن کی قدر شناسی صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جائے۔ ارسطو نے شاعری اور فن بلاغت کے اصول یونانی شعراء کے کلام سے مستنبط کیے تھے اور اس کے معیاری نمونے ہومر اور سوفاکلیس کے یہاں موجود تھے۔ مولانا فراہی کے نزدیک ان دونوں نے شاعری کی بنیاد مصنوعی قصوں اور حکایتوں پر رکھی تھی۔ یہ زیادہ تر مصنوعی اور فرضی تھیں جن کا واقعات کی دنیا سے تعلق نہیں تھا بلکہ یہ ضنمیاتی روایات پر مبنی تھیں۔ چنانچہ مولانا کے الفاظ میں "ارسطو نے یہ سمجھا کہ کلام کی اصل خوبی یہ ہے کہ کسی واقعہ کی اصل تصویر کھینچ دی جائے، واقعہ فی نفسہٖ صحیح ہو یا نہ ہو اس سے غرض نہیں"۔ یعنی واقعہ صحیح ہو یا غلط "اگر اس طرح ادا کر دیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے تو حُسن کلام کا مزا حاصل ہو جائے گا۔ پھر اس نے شاعر کے تخلیقی ذوق کا رشتہ انسان کی جبلّت سے جوڑنے کی کوشش کی۔ یعنی "نقل کرنا بچپن سے انسان کی جبلت ہے۔ اسی باعث وہ دوسرے جانوروں سے ممتاز ہے کہ وہ سب سے زیادہ نقال ہے اور اسی جبلّت کے ذریعہ اپنی سب سے پہلی تعلیم پاتا ہے۔ اس طرح تمام آدمی قدرتی طور پر حظ حاصل کرتے ہیں"[1]

مولانا فراہی نے ارسطو کے محاکات کے نظریہ کو غلط قرار دیا۔ ان کے نزدیک یہ دعویٰ کہ انسان میں محاکات کا مادہ سب جانوروں سے زیادہ ہے محض غلط ہی نہیں، بے بنیاد ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ "بچہ جو اپنے ماں باپ کی نقل کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس میں تمام خصائل انسانی بالقوۃ موجود ہوتے ہیں۔ البتہ یہ خصائل نمونہ و مثال دیکھنے سے ابھرتے اور ظہور کرتے ہیں۔ انسان میں جو قوتیں خدا نے رکھی ہیں وقتاً فوقتاً خود ان کا

[1] بوطیقا ترجمہ عزیز احمد ص ۳۹

ظہور ہوتا ہے۔ محاکات کی فطرت کی وجہ سے نہیں وجود میں آتی ہیں"[1]

مولانا فراہی نے یونان کے حکماء، بالخصوص ارسطو کی شعر کی حقیقت اور منصب کو سمجھنے میں دوسری لغزشوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یونان میں چونکہ ارسطو کے عہد میں شاعری سے مذاقیہ جلسوں کو گرم کرنے کا کام لیا جاتا تھا اور شعراء عموماً مذاقیہ قصے نظم کیا کرتے تھے اس لیے شاعروں کو سخن ساز اور دروغ باز کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اسی بنا پر افلاطون اپنے عہد کے شاعروں کو دروغ گو، جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اور دوسرے درجہ کی نقالی یعنی نقل کی نقل کا قصوروار ٹھہراتا ہے اور اپنی ریاست سے ان کے اخراج کا مشورہ دیتا ہے تاکہ لوگوں کے اخلاق خراب نہ ہوں۔ ارسطو اگرچہ شاعری کی حمایت میں قلم اٹھاتا ہے اور اپنے استاد افلاطون کے اعتراضات کا جواب دینا چاہتا ہے لیکن وہ بھی شاعروں کے اصل منصب کی نشان دہی میں زبردست ٹھوکر کھاتا ہے اور اپنے ماحول سے اثرات قبول کرتے ہوئے شاعری کا اصل مقصد لطف انگیزی قرار دیتا ہے اور لطف انگیزی کی خاطر راست گوئی کو ترک کرنے اور واقعہ کے گھٹانے بڑھانے کو جائز قرار دیتا ہے۔ مولانا فراہی سوفاکلیس کے اپنے معترضین کے اس اعتراض پر کہ تم نے لوگوں کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اصل کے مطابق نہیں، اس جواب کو غلط قرار دیتے ہیں کہ میں نے ان کا ویسا حلیہ بیان کیا ہے جیسا ہونا چاہیے نہ کہ جیسا اُن کا واقعی حلیہ ہے"۔ ارسطو نے سوفاکلیس کے اسی نقطۂ نظر کو اپنے تصور شعر و ادب کی بنیاد بنایا اور اس سے حقیقت کو مسخ کرنے اور جھوٹے طلسم باندھنے کا دروازہ شاعری میں کھل گیا اور اس طلسم سازی کو نظریاتی بنیادیں فراہم ہوگئیں نیز تاریخ کے ایک طویل دور میں مشرق و مغرب میں ارسطو کے اسی نظریہ کو لوگوں نے شعر کی اساس اور اس کے ناپنے کا پیمانہ بنا لیا۔ مولانا فراہی اس صورت حال کی طرف اشارہ فرماتے ہیں: "ارسطو نے جھوٹے طلسم باندھنے کو کمال شاعری قرار دیا۔ علمائے اسلام نے بھی فرمایا 'احسن الشعر اکذبہ' یعنی اچھا شعر وہ ہے جس میں زیادہ جھوٹ ہو"۔ حالانکہ اسلامی عہد کے عربی ادب کے ناقدین کے لیے

[1] جمہرۃ البلاغۃ کی تلخیص بحوالہ مقالات شبلی حصہ دوم

شعر کو اس سے زیادہ بہتر پس منظر میں سمجھنے سمجھانے کے لیے اچھا خاصا مواد ان کے ادبی سرمایہ میں موجود تھا۔ خود عہدِ جاہلیت میں شاعری صداقت و حقیقت کے بہت زیادہ قریب تھی اور تفنن طبع کے بجائے معاشرہ میں سنجیدہ اور مہتم بالشان کردار ادا کرتی تھی۔

مولانا فراہی نے ارسطو کے بلاغت کے بارے میں تصورات کو بھی آنے والی نسلوں کے لیے بے حد گمراہ کن قرار دیا۔ ارسطو نے چوں کہ فنون لطیفہ اور تخلیقی ادب کو نقالی اور محاکات کا نتیجہ قرار دیا تھا اس لیے اس کی شعریات میں ادب تصویر کشی قرار پایا اور بلاغت کا یہ اولین منصب ٹھہرا کہ وہ مضمون کو جیوں کا تیوں ادا کرے۔ یعنی خیالات و مطالب کی صحت و خوبی کے ساتھ ادائیگی ارسطو کے نزدیک محاکات کا بنیادی تقاضا ہے۔ اُسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ جو مطالب ادا کیے جا رہے ہیں وہ عمدہ و صحیح ہیں یا خراب و مکروہ۔ ارسطو کے اس طرزِ فکر کی چوٹ یہ پڑی کہ ادب میں ہیئت پرستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی اور اس سے مشرق و مغرب کے بے شمار اہل نظر متاثر ہوئے۔ خود عربی ادب کا باوائے تنقید ابوجعفر قُدامہ اپنی تصنیف "نقد الشعر" میں رقم طراز ہے: "اگر کسی شعر میں کوئی بیہودہ اور لغو مطلب ادا کیا گیا ہے تو اس سے شعر کی خوبی پر اثر نہیں پڑتا ہے۔" یعنی مضمون کوئی ہو اُسے صرف خوبی و لطافت سے ادا کر دینا فن کار کی اصل ذمہ داری ہے۔ لطف یہ ہے کہ جاہلی دَور میں عرب فن کاروں کے یہاں الفاظ کا خیال اس قدر نہیں تھا جتنا معنی پر زور دیا جاتا تھا اور یہ دیکھا جاتا تھا کہ شاعر نے قبائل کے رسوم و ضوابط کا کہاں تک خیال و لحاظ کیا ہے اور ارسطو کے اثرات مترتب ہونے کے بعد علمائے اسلام نے بھی بلاغت کی اصل روح تشبیہ و تمثیل کو قرار دیا۔ تشبیہ بھی ایک قسم کی مصوری ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغہ میں لکھا ہے کہ بلاغت کے مہمات مسائل تشبیہ ہی سے متفرع ہیں۔ پھر تشبیہ سے ایک قدم آگے بڑھ کر استعارہ کو جب شاعری کا حُسن قرار دیا گیا تو شاعری میں واقعیت کا جو پہلو تھا وہ بھی رخصت ہونے لگا۔ اس لیے کہ مولانا فراہی کے الفاظ میں یہ تمام تر جھوٹ اور مبالغہ پر مبنی ہوتا ہے۔ علمائے اسلام یہ سمجھنے لگے کہ بلاغت اور شاعری میں جھوٹ کو سچ پر ترجیح ہے۔ اس طرح مبالغہ اور کذب بلاغت اور شاعری کا جوہر قرار پایا اور یہ آندھی صدیوں عربی، فارسی اور اردو شاعری پر چلتی رہی۔

مولانا فراہی کی اوّلیں صدائے احتجاج تھی جو اس طوفان کے خلاف اٹھی۔ انھوں نے پہلی بار واضح طور پر یہ کوشش کی کہ ارسطو نے پوری دنیائے تنقید کو جس پٹڑی پر ڈال دیا ہے اس سے ہٹا کر صحیح پٹڑی پر لایا جائے، ان کے خیال میں شاعری کو بہر حال اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ فنون لطیفہ بالخصوص شاعری کا تخلیقی محرّک نقّالی و محاکات کی جبلّت نہیں، اور ادب کا مقصد تفریح و دل بستگی نہیں نیز لفظ سے زیادہ جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ معنی ہے۔

مولانا فراہی کے نزدیک نطق و بلاغت کی حقیقت یہ ہے کہ نطق کی صفت کی بنا پر وہ تمام مخلوقات سے ممتاز ہے۔ نطق آواز، لہجہ یا راگ نہیں بلکہ نطق سے مراد دل میں جو خیالات آئیں ان کے اظہار کی قوت کا یہ نام ہے۔ عقل کی بنا پر انسان غور و فکر کرتا ہے اور جب عقل اس کو ظاہر کرنا چاہتی ہے تو نطق کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے۔ یعنی نطق عقل کا آلہ ہے۔ مولانا فراہی کے نزدیک محاکات، نطق ہی کا ایک نتیجہ ہے۔ اگر نطق نہ ہوتی تو محاکات بھی نہ ہوتی۔ نطق کا کمال یہ ہے کہ خیالات صحت و خوبی سے ادا ہوں نیز خیالات خود بھی عمدہ و صحیح ہوں۔ اس طرح مولانا نے الفاظ کے مقابلہ میں معنی کو، اور طرزِ ادا کے مقابلہ میں مضمون کو فوقیت عطا کی۔ ان کے خیال میں الفاظ کبھی کبھی مضمون کا حجاب بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی مضمون اس حجاب کو چاک کر کے دل میں اُترتا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر یہ طرزِ فکر عطا کیا کہ ہیئت پرستی کے بجائے فکر بلند اور نگاہِ حقیقت رس پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ حسن کلام بہر حال الفاظ کا پابند نہیں۔ مولانا کے اس خیال نے بلاغت کو صحیح بنیادوں پر کھڑا کر دیا کہ مضمون اصل ہوتا ہے نہ کہ الفاظ۔ لغت میں بلیغ کے معنی ہیں پہنچنے والے کے، اور جو چیز دل کو پہنچتی ہے وہ دراصل معنی ہیں الفاظ نہیں جیسا کہ اس شعر سے واضح ہوتا ہے:

ان الکلام لفی الفواد و انما
جعل اللسان علی الفواد دلیلا

یعنی کلام دل میں ہوتا ہے زبان اور زبان سے نکلنے والے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں، بقول اکبر:

اثر ہو سُننے والے پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

اور اثر سننے والے پر اسی صورت میں ہوتا ہے جب خود مضمون اثر انگیز ہو ۔۔۔ حیرت ہے کہ علمائے بدیع و بیان نے کیونکر اس حقیقت کو ارسطو کے غلط یا صحیح اتباع میں فراموش کر دیا تھا کہ بیہودہ مضمون اگر فصیح الفاظ میں بھی ہو تو دل میں جگہ نہیں کر سکتا۔ مولانا فراہی نے بلاغت کی از سر نو تعبیر کرتے ہوئے اسے عقل کا دست و بازو، انسانیت کا عنصر، راستی کی مترجم اور فخر کا تاج قرار دیا۔ انھوں نے خود شاعری کے مادّہ اور اصل و اساس کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔ شاعر صاحب شعور ہوتا ہے اور شعور احساس سے بالیدہ ہوتا ہے۔ اس طرح مولانا فراہی نے الفاظ و بیان سے زیادہ شاعر کی شخصیت اور اس کے دل و نگاہ کو اہمیت عطا کی۔ تجربۂ حیات کی کثرت نگاہ پر مبنی ہے اور انسان کے احساس کا وزن و وقار دل پر منحصر ہے۔ روشنیٔ دل و نگاہ کس طرح پیدا ہوتی ہے اور شخصیت کس طرح ہمہ گیر بنتی ہے اس پر غور کیجیے تو شاعری کا تعلق لامحالہ علم اخلاق سے ہو جاتا ہے۔ ہر ایک فن کی تشکیل میں شخصیت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ شاعر کی ذہنی ساخت پر اچھے یا بُرے شعر کی تشکیل کا انحصار ہے۔

اب ہم یہ جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ ارسطو سے شعریات کے پیمانے بنانے میں جن غلطیوں کا صدور ہوا اس کے اثرات مغرب و مشرق کی تنقید پر کیا مرتب ہوئے جن کے سبب مولانا فراہی کی نشاندہی کے بموجب ہمارے یہاں فن شاعری کا صحیح بنیادوں پر ارتقا نہ ہو سکا اور اس کا احتساب کرنے اور جائزہ لینے والے نقاد بھی مسلسل کن فکری لغزشوں سے ہمکنار ہوتے رہے۔

ارسطو کے محاکات کے تصور پر ہمارے ناقدین نے بڑی بڑی فلسفہ آرائیاں کیں اور بے شمار حاشیے چڑھائے گئے۔ ان لوگوں کو اس بات پر بے حد مسرت تھی کہ انسان کی ایک جبلّت یعنی عمل تقلید کا رشتہ ارسطو نے اس کے ذہنی جذباتی و عقلی عمل یعنی عمل تخلیق سے جوڑ دیا ہے۔ ان کو اس پر بھی خوشی تھی کہ جمالیات کا رشتہ اخلاقیات سے منقطع کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اسکاٹ جیمس رقم طراز ہے: "افلاطون نے اخلاقیات اور جمالیات کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ ارسطو نے اس گڑبڑ کو دور کر کے جمالیات کی بنیاد رکھی۔"[1]

۱؎ MAKING OF LITERATURE BY SOCTT JAMES P. 59

افلاطون کا تصور یہ تھا کہ اس نے اس دنیا یعنی عالم اسفل کو عالم مثال کی نقل اور فنون لطیفہ کو نقل کی نقل یعنی تیسرے درجہ کی چیز قرار دیا تھا۔ اس نے اپنے عہد کے ادب سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تمام شاعرانہ نقلیں سامعین کے لیے ضرر رساں ہیں۔ ان کی اصل حقیقت کا علم ہی اس کا سدّباب کر سکتا ہے۔[1]

افلاطون نے ادب کے مطالعہ میں بقول حامد اللہ افسر "سب سے زیادہ اہمیت مواد کو دی تھی اور اخلاق کو اس کا ضروری وصف قرار دیا تھا۔ اسلوب بیان اور تفریح خاطر کو اس نے کوئی وقعت نہیں دی ہے۔ اس کے نزدیک ادب کی خوبی کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس میں ان مادّی و خارجی اشیا کا عکس جو اس کا موضوع ہیں کس حد تک صداقت کے ساتھ موجود ہے۔"[2]

ارسطو نے اپنے خیال میں شاعری کو بزعم خویش خود اپنے قدموں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے شاعری کو ایک مستقل بالذات فن قرار دیا جس کا فن کار اپنی مشق و ریاضت سے اکتساب کرتا ہے۔ اسلوب یا طرز بیان فن کار کی فن کارانہ شخصیت کا تعین کرتا ہے۔ ارسطو نے یہ بھی کہا کہ تاریخ خاص حقیقت کو بیان کرتی ہے اور شاعری عام حقیقت سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ بقول عزیز احمد "مشرق پر اس ایک جملہ کا اثر اتنا ہوا کہ شاید ہی کسی اور تنقیدی اصول کا ہوا ہو۔ چنانچہ مشرق کی تمام تر شاعری خواہ وہ فارسی ہو، ترکی ہو، یا اردو، ارسطو کے اس ایک اصول کے جاگزیں ہو جانے کے باعث عام روش پسند کرتی رہی اور انفرادی جذبات، خاص جذبات اور خاص واقعات سے احتراز کرتی رہی۔ اسلامی مشرق کے شعراء اگر ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اپنے اسالیب بیان و زبان یا دوسری شاعرانہ خصوصیات کی وجہ سے لیکن جہاں تک مضامین کا تعلق ہے سب کے مضامین کی انہیں عام روایات پر بنیاد ہے جو مشرقی شاعری کا صدیوں تک موضوع بنے رہے۔"[3]

۱؎ قدیم ادبی تنقید۔ وہاب اشرفی۔ ص ۶۲

۲؎ نقد الادب، ص ۴۶، نولکشور ۱۹۲۱ء

۳؎ عزیز احمد، بوطیقا ص ۱۹

لطف یہ ہے کہ شعریات کے معاملہ میں تو عالم اسلام کے ماہرین علم بیان یونان سے متاثر تھے ہی، دوسری طرف یونان کے فلسفیانہ خیالات نے بھی عرب وعجم کے لوگوں کو بُری طرح متاثر کیا اور بقول حالی: "بطلیموس وارسطو کے خیالات گلی کوچوں میں منتشر ہو گئے تو الحاد بے دینی نے لوگوں کے دلوں میں چٹکیاں لینی شروع کیں یہاں تک کہ نصوص قرآن اور احادیث نبوی پر دھڑا دھڑ اعتراضات ہونے لگے۔"[1]

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ عربوں کے یہاں عہد جاہلیت میں الفاظ کا زیادہ خیال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ عام طور پر تنقید کے وقت معانی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اظہار معنی میں وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ شاعر نے جو بات کہی ہے وہ قبائل کے عقائد اور سوسائٹی کے عام رسوم پر کہاں تک منطبق ہے۔ ایسے شاعروں کو ترجیح دی جاتی تھی جن کے یہاں جذبات آفرینی اور ولولہ انگیزی زیادہ ہو۔[2]

لیکن بوطیقا کے اثر سے عربی تنقید اس موقف سے ہٹ گئی۔ ارسطو نے تو قرین قیاس ناممکن الوقوع کی مصوری و ترجمانی کی اجازت دی تھی۔ ہمارے مشرق کے شعرا مبالغہ میں اس قدر آگے بڑھے کہ ناقابلِ قیاس و ناممکن الوقوع کو اپنا محور بنا لیا۔ قدامہ نے بعض اصناف شعر میں خلاف قیاس ناممکنات پر زور دیا، ابن المعتز اور ابن حجہ حموی نے بھی یونانیوں کی آواز سے آواز ملائی۔ ڈاکٹر عبداللہ کے بقول شعر میں کذب کا مطلب یہ تھا کہ وہ حقیقت واقعی کے مطابق نہیں۔ اس معاملہ میں یونانی ناقدین قدامہ کے ہم خیال ہیں۔[3]

قدامہ نے تو اس حد تک قافلہ شعر وادب کو پہنچا دیا کہ "اگر کسی شعر میں کوئی بیہودہ اور لغو مطلب ادا کیا گیا ہو تو اس سے شعر کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"[4]

---

[1] مقالات حالی اوّل، ص ۷۳، انجمن ترقی اردو ۱۹۸۲ء

[2] اردو تنقید کا ارتقاء، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۶۹

[3] اشارات تنقید، ص ۲۲۷

[4] مقالات شبلی حصہ دوم، ص ۲۱

عبدالقاہر جرجانی نے بھی شعر کو انبساط کا وسیلہ اور ذوق جمال کی تسکین کا ذریعہ اور لطف مہیا کرنے کا سامان قرار دیا۔ یہاں بھی ارسطو ہی کی آواز پس پردہ سنائی پڑتی ہے جس نے شاعری کو محاکات اور اس کا مقصد لطفِ انبساط کا حصول قرار دیا تھا۔ جاحظ کی "کتاب البیان والتبیین" پر بھی ارسطو کا اثر ہے۔ جاحظ نے لفظ حکایت کو اداکاری اور نقالی کے مترادف قرار دیا ہے۔[1]

ان کے علاوہ ابن قتیبہ، باقلانی، ابن رشیق قیروانی، ابن المعتز اور ابن خلدون وغیرہ نے یونانی شعریات کی ٹیڑھی بنیاد پر اپنے افکار کی عمارت تعمیر کی، شاعری کو مصوری سمجھتے ہوئے بلاغت کی روح تشبیہ وتمثیل کو سمجھتے رہے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ شاعری علاً پیغمبری نہ رہی بلکہ ہمارے مشرق ومغرب کے اہل قلم ادب برائے ادب کی وادی میں بے جادہ ومنزل بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ یونانی ادب برائے ادب کے قائل تھے اور انھیں کے تتبع میں حامد حسن قادری کے الفاظ میں "قدیم عرب نقاد ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔" شعر وادب میں اسلوب وبیان کو خاص اہمیت دیتے ہیں، علم معنی وبیان میں بڑی باریکیاں پیدا کی ہیں۔ حیرت ہے کہ انھوں نے اس معاملہ میں قرآن حکیم سے رہنمائی کیوں حاصل نہ کی جس نے کذب ومبالغہ کے بجائے حقیقت اور سچائی کی تلقین کی ہے، شاعری اور دیگر علوم وفنون کو رشد وہدایت کا وسیلہ اور خیر وصداقت کا ترجمان بنانے پر زور دیا ہے۔

لطف یہ ہے کہ شعر وادب ہی نہیں زندگی وکائنات کے بارے میں اپنے بنیادی تصورات میں بھی ہمارے علما افلاطون وارسطو کی گداگری میں مبتلا ہو گئے۔ بقول شبلی اخلاقیات میں بھی صوفی منش علما، ارسطو وافلاطون سے متاثر ہو کر توازن واعتدال کو زندگی کی بنیادی قدر قرار دیتے ہیں۔ ارسطو وافلاطون نے زندگی کو خیر وشر کے عناصر کے درمیان ایک لطیف اعتدال وتوازن قائم رکھنے کو نیکی سے تعبیر کیا ہے جو اپنے آپ میں نہ اچھے ہیں نہ بُرے بلکہ اپنے وسائل کی صحیح یا غلط ترتیب کرنے پر یا تو ایسی ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں جسے نیکی کہا جائے یا تو ایسا انتشار

---

[1] اشارات تنقید، ص ۲۳۴

واختلال پیدا کر سکتے ہیں جسے بدی کہا جاتا ہے۔[1]

فارسی تنقید عربوں کے نقش قدم پر چلتی نظر آتی ہے۔ فارسی میں رشید بلخی کی کتاب "حدائق السحر فی دقائق الشعر"، شمس قیس رازی کی "المعجم فی معاییر اشعار العجم" عوفی کی "لب الالباب" امیر خسرو کی "اعجاز خسروی" پر نظر ڈالیے تو سبھی کے یہاں عرب نقادوں کے خیالات کا انعکاس نظر آتا ہے اور لفظ و معنی کے مباحث، صنائع و بدائع، فصاحت و بلاغت اور عروضی نظام نقد کی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں۔ فارسی نقادوں کے یہاں بھی عروض، ظاہری خوبیوں اور اسلوب وہیئت کو پرکھنے کے پیمانے موجود ہیں اور معنوی خوبیوں سے زیادہ لفظی صناعی پر زور دیا گیا ہے۔ گویا یہاں بھی ارسطو کے تصور محاکات کا طلسم قائم ہے یعنی جس نے اچھی تصویر کشی کی وہی کامیاب فن کار ہے اس لیے کہ جو تصویر بالکل مطابق اصل ہوتی ہے اُسے دیکھ کر لطف وانبساط حاصل ہوتا ہے۔

اردو ادب اور تنقید کی جب بنیاد پڑی تو فارسی و عربی ادب کا بول بالا تھا۔ اردو تنقید کا ارتقا بھی فارسی و عربی تنقید کی رہنمائی میں ہوا۔ ظاہری حسن و آرائش شعر کی سب سے بڑی خوبی قرار دی گئی اور فکر و خیال یا موضوع و مواد سے خال خال بحث کی گئی۔ نفس مضمون سے زیادہ شیوۂ گفتار پر داد و تحسین کے نعرے بلند کیے گئے۔ ہمارے تذکرہ نگاروں نے فن کار کے طرز فکر پر کبھی کوئی بحث نہ کی۔ موضوع سنجیدہ ہے یا غیر سنجیدہ اس سے ان کو بہت کم تعلق رہا۔ البتہ شعر کی بنیادی خوبی یہ قرار پائی کہ تکلف و آورد سے پاک اور تشبیہات و استعارات سے مرصع ہو، زبان سادہ بندش چست اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کر دیے جائیں۔ ہمارے بزرگوں کو پیرایۂ بیان سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ چھوٹتے ہی فصاحت و بلاغت کے اصولوں کی پابندی، محاوروں کی صحت، وزن و قافیہ کی درستی پر بحث شروع کر دیتے تھے۔ اس کے لیے ان کے پاس سب سے ٹھوس بنیاد یہی تھی کہ استادان یونان ایسا ہی کچھ فرما گئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ارسطو اور دیگر یونانی نقادوں نے شعر و ادب کی غایت حقیقت

---

[1] مقالات شبلی جلد ہفتم، ص ۴۵

پر جو کچھ لکھا تھا اس کو کچھ مسخ کر کے ہی پیش کیا گیا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "فلاسفۂ یونان کہتے ہیں شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں، قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر ادا کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔"[1]

گو واقعیت و اصلیت سے اس درجہ یونان میں دامن نہیں چھڑایا گیا ہے۔ آزاد کے لاشعور میں شاید ارسطو کا نقالی والا نظریہ کار فرما ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی عہد سرسید کی اصلاحی وافادی ادب کی لہروں سے بے نیاز رہتے ہوئے انداز بیان اور اسلوب کی اہمیت پر بار بار زور دیتے ہیں اور فن کار کے فکر و خیال کی خلوتوں میں داخل نہیں ہوتے۔ امداد امام اثر بھی لفظ نقل سے دامن نہیں چھڑا پاتے اور اس چبائے ہوئے بدمزہ نوالے کو اپنے قارئین کے حوالے اس انداز سے کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے بزرگوں کی ذہنی مرعوبیت پر افسوس ہوتا ہے۔ رقم طراز ہیں:

> "شاعری حسب خیال راقم رضائے الٰہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ یا معنی کے ذریعہ ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین قدرت ہیں جنھوں نے حسب مرضی الٰہی نفاذ پایا ہے اور جن کے مطابق عالم درونی و بیرونی نشوونما پا گئے ہیں۔ ضروری ہے کہ جو شاعر ہو وہ رضائے الٰہی کی نقل پوری صورت کے ساتھ الفاظ یا معنی کے ذریعہ اُتارے۔"[2]

یہ ارسطو کی کرم فرمائی تھی کہ اس نے شاعر کو مرتبہ شعور سے نقالی کی سطح تک پہنچا دیا تھا۔ ضرورت ہے کہ ایک بار پھر محاکات کے سلسلہ میں اس کے فرمودات کو نذر قارئین کیا جائے۔ وہ رقم طراز ہے:

---

[1] آب حیات، ص ۸۵، ۱۹۶۳ء

[2] کاشف الحقائق۔ امداد امام اثر، مرتبہ وہاب اشرفی، ص ۵۱-۵۲

"جس طرح آدمی اپنے فن کے لیے اور کچھ عادتاً رنگ یا شکلوں کے ذریعہ مختلف چیزوں کی نقل اُتارتے ہیں اسی طرح مذکورہ بالا فنون (رزمیہ شاعری، المیہ، طربیہ، بھجن، بانسری و چنگ وغیرہ) میں موزونیت الفاظ اور نغمے وہ مختلف ذرائع ہیں جو یا الگ الگ یا طرح طرح سے ایک دوسرے سے مل کر یہ سب نقلیں پیدا کرتے ہیں۔"[1]

خواجہ الطاف حسین حالی ارسطو کا نظریہ میکالے کے حوالے سے پیش کرتے ہیں اور فخر کے ساتھ شاعری کو نقالی قرار دیتے ہیں۔ میکالے بھی ان کا ہم خیال ہے البتہ وہ اس میں تخیل کا اضافہ کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ ذہن میں پہلے سے مہیا ہو چکا ہے اس کو مکرّر ترتیب دے کر نئی صورت بخشتی ہے۔

حالی کے نزدیک شعرا کا حُسنِ قبول ان کی جادو بیانی پر منحصر ہے۔ لیکن وہ شاعری کا تعلق علم اخلاق سے جوڑتے ہیں۔ ان کے خیال میں "اسی بنا پر صوفیائے کرام کے ایک جلیل القدر سلسلہ میں سماع کو جس کا جزو اعظم اور رکن رکین شعر ہے وسیلہ قرب الٰہی اور باعث تصفیۂ نفس اور تزکیۂ باطن مانا گیا ہے۔"

غرض شاعری کا جذبات سے رشتہ استوار کر کے اور اسے خوشی اور مسرت کے حصول کا وسیلہ قرار دے کر حالی بھی یونانی ناقدین کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ارسطو کے نظریہ کو تسلیم کر لیتے ہیں جس کے تحت شاعری انسانی نفس کے فاسد مادے کو سرد کر کے تقرّب الٰہی کی منزلیں طے کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

علامہ شبلی وہ واحد نقاد ہیں جنھوں نے ارسطو کے سلسلہ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کے خیالات اور اس کی شعریات پر مولانا کے کل تنقیدی نکات کی تائید کی ہے لیکن وہ بھی ارسطو کے طلسم سے خود کو آزاد نہیں کر سکے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شمیم اطہر صدیقی شبلی ارسطو پر تو نکتہ چیں ہیں لیکن جب وہی نظریات فن شعوری یا غیر شعوری طور پر ابن رشیق، الفارابی، محقق طوسی اور

---

[1] بوطیقا، ص ۴۲-۴۳

جرجانی وغیرہ کے توسط سے اخذ کرتے ہیں تو اسے بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ ارسطو پر معترض تو ہیں لیکن اپنی تحریروں سے یہ تاثر دیتے ہیں کہ "اگر موضوع کے انتخاب میں غلطی ہو جائے تو شعر کی خوبی و شعریت پر حرف نہیں آئے گا۔" شبلی بھی مبالغہ کے قائل ہیں البتہ کذب کے مخالف ہیں، یعنی مبالغہ کو قیاس کی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ ارسطو بھی اسی حد تک مبالغہ کا قائل ہے اور قانون لزوم اور قانون احتمال کے دائرہ میں اس کے جواز کا قائل ہے۔ شبلی شعر کو محض کوری نقالی نہیں تسلیم کرتے۔ وہ شعر العجم میں رقم طراز ہیں: "شعر جیسا کہ ارسطو کا مذہب ہے ایک قسم کی مصوّری ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادّی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات و احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔"[1] اسکاٹ جیمس بھی ارسطو کی نقل کو زندگی کی تخیلی تعمیر نو قرار دیتا ہے[2]

شبلی محاکات کا پشت پناہ تخیل کو بتاتے ہیں اور نطق کو تخلیق شعر کا سبب مانتے ہیں لیکن نطق و فواد پر انھوں نے زیادہ توجہ نہیں کی اور بالآخر محاکات کو انسان کا قوی تر جذبہ تسلیم کر لیا ہے جس کے طاری ہونے پر زبان سے موزوں اشعار نکلنے لگتے ہیں۔ مزید برآں شبلی بھی شعر کی تشریح میں اس روایتی فکر سے ہم آہنگ ہیں کہ جو کلام جذبات انسانی کو برانگیختہ کرے اور اس کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔ افلاطون کو شاعری پر یہی اعتراض تھا کہ یہ بنیادی صداقتوں تک کیوں کر رسائی حاصل کر سکتی ہیں جب کہ اس کا سفر مشتعل جذبات کی سطح پر ہوتا ہے۔ شبلی بھی ارسطو کے اس بنیادی تصور میں اس کے ہم آواز ہیں کہ شعر کا مقصد سرور و انبساط ہے۔ چنانچہ وہ شاعر کے بارے میں رقم طراز ہیں: وہ فلاسفر کی طرح کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو خوش کرنا چاہتا ہے۔"[3] حیرت ہے کہ شبلی جو سر سید کی اصلاحی تحریک سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے اور جنھوں نے مشرق کے تابناک ماضی کی ثنا خوانی

---

[1] شعر العجم حصہ اول، ص ۱۱ سنہ ۱۹۷۳ء

[2] MAKING OF LITERATURE P. 53

[3] شعر العجم حصہ چہارم، ص ۱۰

کی اور جو مذہب و اخلاق کو انسان کی شخصیت کی تعمیر کا بنیادی عنصر تصور کرتے تھے شعر کے بارے میں اس سطحی طرز فکر پر کس طرح قانع ہو گئے حالانکہ وہ مولانا فراہی کی جمہرۃ البلاغۃ پر جب اظہار خیال کرتے ہیں تو عرب کے ممتاز جاہلی شاعر زہیر ابن سلمٰی کے ان اشعار کو جیسے خود مولانا فراہی نے نقل کیا اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ زہیر نے یاوہ گوئی، فضول گوئی اور مسجع و قافیہ کے ان پرستاروں پر جو حق کی حمایت اور معروف کی تائید سے گریز کرتے ہیں زبردست تنقید کی ہے اس طرح اس نے شاعری کو فقط لوگوں کو خوش کرنے کا وسیلہ بنانے کے بجائے حق کی حمایت اور معروف کی تائید کا ذریعہ قرار دیا ہے:

وذی نعمة تممتها وشکرتها	وخصم یکاد یغلب الحق باطله
دفعت بمعروف من القول صائب	اذا ما اضل الناطقین مفاصله
وذی خطل فی القول یحسب انه	مصیب فما یلمم به فهو قائله
عبأت له حلما واکرمت غیره	واعرضت عنه وهو بادٍ مقاتله

غرض گزشتہ ایک ہزار سال سے حالؔی کے الفاظ میں ہماری شاعری کی کل مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ الفاظ کے پرزوں سے چلتی رہی، ہمارے بزرگوں نے اجتہادی نگاہ اور انقلابی انداز فکر کا مظاہرہ نہ کیا۔ مشرق و مغرب کی شعریات میں یہ تنہا آواز مولانا حمید الدین فراہی کی ہے جو محاکات اور حصول حظ کے طلسم سے شاعری کو نجات دلانے کے لیے بلند ہوتی ہے اور شاعر کو عقل کی سفارت و پیامبری کی منزل تک لانا چاہتے ہیں۔ نقل کے بجائے غور و فکر اور تلاش حق کو شاعری کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں اور مرصع سازی و ہیئت پرستی کے بجائے قلب و نگاہ کی بالیدگی، فکر و خیال کی بلندی، خون جگر اور اخلاص کی فراوانی کو شاعر کے لیے بنیادی اوصاف میں شمار کرتے ہیں۔ شاعری کو اس خود غرض دنیا میں شریفانہ جذبات کو زندہ رکھنے کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔ شاعری میں زندگی کی تنقید اسی وقت ممکن ہے جب کہ فن کار علم بیان کے ساتھ بلاغت کے صحیح تقاضوں کا ادراک رکھتا ہو۔ مولانا فراہی نے اسی غرض سے بلاغت کے ایک واضح شاہراہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کلام میں الفاظ سے زیادہ فکر صالح کو اہمیت عطا کی۔ قول بلیغ جو دل میں اتر جائے فکر صالح کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ کلام کی غایت اگر عقل کی سفارت ہے تو

ضروری ہے کہ فن کار صدق و راستی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے دے۔ مولانا عروج قادری رقم طراز ہیں کہ: "عرب نہ اس کلام کو بلیغ کہتے تھے جس میں متکلم نے اپنے نفس کی خباثت انڈیل دی ہو اور نہ اس کو جو ابہام کا شکار ہو۔ ایسے شخص کو عرب عاجز عن الکلام کہتے تھے۔"[1]

مولانا فراہی جمہرۃ البلاغۃ میں تفصیل سے جاہلیت عرب کے کلام سے اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ وہ لوگ کلام کی تعریف حسن معنی ہی کی بنا پر کرتے تھے اور قبیح المعنی اشعار کی مذمت کرتے تھے چاہے وہ کتنی ہی فنی چابک دستی سے ادا کیے گئے ہوں۔ امرؤ القیس اسی لیے ضلیل کے لقب سے ملقب ہوا کہ اس کے کلام میں عریانی و فحاشی کی آمیزش تھی۔ مولانا فراہی کے خیال میں تشبیہ و تمثیل معنی کی توضیح و تشریح کے لیے ہوتی ہیں نہ کہ فقط کلام میں حسن پیدا کرنے کے لیے۔ اس معاملہ میں قدماء نے جو افراط و تفریط کا رویہ اختیار کیا اس پر مولانا شکوہ سنج ہیں۔ انھیں افسوس ہے کہ قرآن کی بلاغت کو سمجھانے کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی تشبیہ و تمثیل کی حقیقت کو بگاڑ کر پیش کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عوام و خواص دونوں کا ذوق بگڑتا گیا۔

غرض شعر کے منصب اس کی حقیقت اور بلاغت کے رموز پر مولانا فراہی کے تاثرات بے حد انقلاب آفریں ہیں۔ مذکورہ بالا سطور میں یونان کے ماہرین شعریات سے لے کر مغرب اور بالخصوص مشرق میں شعر کی تعیین قدر کے سلسلہ میں جو لغزشیں ہوئیں مولانا فراہی نے اس پر پہلی بار جرأت کے ساتھ تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ مولانا کے فرمودات کی مزید تشریح و توضیح کی ضرورت ہے اور قرآن نے فنون لطیفہ کے سلسلہ میں جو نقطۂ نظر عطا کیا ہے اور بلاغت کی جن حدوں کا تعین کیا ہے اس پر مزید غور و خوض کی ضرورت ہے تاکہ یونانی و مغربی اور ایک حد تک قدیم مشرقی شعریات سے الگ اسلامی شعریات کے خد و خال متعین کیے جا سکیں۔ مولانا فراہی کی جملہ تصانیف کے گہرے مطالعہ کے بعد مستقبل کا نقاد مجھے یقین ہے کہ اسلامی شعریات کی حقیقت کو پوری طرح واضح کر سکے گا۔

---

[1] ماہنامہ دانش، اداریہ ستمبر ۱۹۵۶ء